اردو زبان، اسلوب وبیان کے ماہر

جناب تارا چرن رستوگی

اتر پردیش ریاست کا سرکاری ماہنامہ ''نیا دور''، جو سید امجد حسین کی ادارت میں شائع ہوتا ہے ،متعدد خصوصی نمبر (بشمول حالیہ ''اودھ نمبر'') جملہ مختصات کے ساتھ پیش کر چکا ہے۔ چونکہ علاقہ ''اودھ'' جس کا مرکز لکھنؤ رہا ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں کہ فروغ اردو ادبیات میں مخصوص روایت ودرایت کا حامل ہے ۔''نیا دور'' کا ''اودھ نمبر'' خاص اہمیت وافادیت کی دستاویز بن کر ابھرا تو ہے اور اردو ادبیات کے مطالعہ میں اس خصوصی نمبر کو بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا، مگر اس میں کچھ تشنگی بھی نظر آئی۔ اس میں مولانا شمسؔ پر کوئی مضمون شامل نہیں ہے اور استاذی جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی پر بھی کوئی سیر حاصل تحریر نہیں ملتی۔ اثرؔ مرحوم ہمہ جہتی جینیس (genius) تھے۔ وہ جموں کشمیر ریاست کے قائم مقام دیوان بھی رہے، جس کا کوئی ذکر ''اودھ'' نمبر میں نہیں ہے

اس مضمون میں مولانا شمسؔ ہی کے اردو زبان نیز اظہار و بیان سے متعلق خیالات، جو ان کی درج ذیل تصانیف سے ابھرتے ہیں، پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔تاریخ زبان اردو، یعنی اردو کی اصل اور اس کے ارتقا کی تاریخ

۲۔لکھنؤ کی زبان

۳۔لکھنؤ کی تہذیب

۴۔شعور وشاعری

۵۔نگارشاتِ رنگ رنگ

ان مقتدر تصانیف میں اس ایک اہم حقیقت کا اظہار بھی غالباً ضروری تھا کہ لکھنؤ کی تہذیب شیعہ اساس ہے اور شیعہ مقتدرات سے متصف حضرات علوم وفنون کی تحصیل وترویج میں خاص مقام ومرتبہ کے حامل رہے ہیں۔ مذہب تو مذہب لکھنؤ کے سروز یر حسن (سابق چیف جسٹس) کے صاحبزادہ سجاد ظہیر ہی کو یوپی میں اشترا کی تحریک کو ترویج دینے اور اس خرد فروزی کو پروان چڑھانے کے تعلق سے خشتِ اول سمجھا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی ہی نے انھیں پاکستان میں تحریک کو سرگرم کار رکھنے کی غرض سے وہاں بھیجا تھا۔ان کے معتقدین میں سبطِ حسن کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ سبطِ حسن مرحوم کی تصنیف ''موسیٰ سے مارکس تک'' اشترا کی نقطۂ نظر سے تہذیب وتمدن کے ارتقا پر سنگ میل تصنیف ہے ۔سجاد ظہیر (عرفِ عام میں بنے بھائی) کی تصنیف ''روشنائی'' اردو ادبیات میں ناقابلِ فراموش تصنیف ہے اور ان کی تصنیف ''انگارے'' جو بتعاون رشید جہاں معرضِ وجود میں آئی ،ترقی پسند افسانوی ادب کی نقیب و رہنما تصور کی جانا چاہیئے۔

مولانا باقر صاحب نے لکھنؤ کو ''کعبۂ عظمت'' کہا ہے، جو ہر اعتبار سے اس شہر کے مختصات ومتصفاتِ تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ صبح سے شام تک کے تمدنی افق وشفق کے مناظر کا دیدہ ورانہ نقشہ پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل کام نہیں ہے۔

لوگ مشتاق تھے، دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے
(عیش)

طعام ،مشروبات کے انواع واقسام آج تک مثالی تصور کئے جاتے ہیں۔عوام وخواص کے نشست وبرخاست پر بھی مرورِ

ایام کا بہت کم اثر پڑا ہے۔ بایں ہمہ پرانا طرزِ حیات تاریخ میں چلا گیا ہے۔ مولانا موصوف نے اس کی لسانی قلمبندی کر کے قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب زبانِ اردو کی مخصوص حنا بندی و مشاطگی کی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے، جس پر ابھی تک سیر حاصل تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

لکھنؤ کی شائستگی و آراستگی نے اردو زبان کو بھی آراستہ و پیراستہ کیا۔ اگر شمس صاحب کی تصنیف ''تاریخ زبان اردو'' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور بین السطور پر توجہ مرکوز رہے تو یہی حقیقت ابھرتی ہے کہ سرزمین لکھنؤ ہی میں اردو زبان میں چار چاند لگے۔ لکھنؤ میں یا آپ چاہیں تو اودھ کہہ لیجئے، بات ایک ہی ہے۔ اودھ میں اردو کی آمد سعادت خاں برہان الملک کی صوبہ داری کے ساتھ ہوئی۔ تاریخی حیثیت سے اردو برج بھاشا سے نہیں، بلکہ سورسینی پراکرت کی اس شاخ سے نکلی ہے جو دلی کے آس پاس علاقوں میں بولی جاتی تھی، جس کو بانگڑو بھی کہتے تھے۔ مولانا شمس کا یہ نتیجہ اخذ کرنا فی الواقع تعجب خیز ہے، کیونکہ محققین اس نتیجہ پر خاصے طویل مطالعات کے بعد پہنچے۔ ہندی کے تمام تر شعرا ملک محمد جائسی، تلسی داس، سورداس، بہاری اور رحمان (عبد الرحیم خانخاناں) مختلف علاقوں کے رہنے والے ہونے کے باوجود ایک سی زبان میں شاعری تخلیق کرتے تھے۔

مولانا موصوف نے سورسینی پراکرت کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے۔ اس پراکرت کی ضمیروں، حرفِ اشارہ، استفہام، جارومجرور، نفی و ایجابی، سابقے، لاحقے وغیرہ پر بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ پانچویں صدی ہجری سے مسلمانوں نے ہند میں فتوحات حاصل کیں اور پرتھوی راج کے بعد مسلم بادشاہوں نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ فوجی چھاؤنی بھی دلی ہی میں قائم کی گئی۔ مسلم افواج میں متعدد مسلم علاقوں کے سپاہی سردار تھے۔ ترکی، دری، پشتو، فارسی وغیرہ ان کی مادری زبانیں تھیں، مگر رابطہ کی زبان کے بطور فارسی ہی مستعمل تھی۔ ملحوظ رہے سپاہ میں زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے، لہٰذا مسلم سپاہ بھی استثنائی نہیں رہی ہوگی۔ دلی میں بولی جانے والی بانگڑو، ہریانوی، سورسینی پراکرت کے اثرات مسلم سپاہیوں پر بھی مرتب ہونے لگے۔ انھوں نے مقامی بولی اپنے الفاظ شامل کرتے ہوئے بولنا شروع کی ہوگی اور عوام بھی فاتحوں کی زبانوں سے مستعمل الفاظ سیکھتے ہوئے اپنی زبان میں بولتے وقت شامل کرنے لگے ہوں گے۔ اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی، جو ہندی، ہندوی، ریختہ وغیرہ کہلانے لگی۔ فوجی چھاؤنیوں میں بننے کی وجہ سے اردو کہلانے لگی۔ غالباً یہاں یہ بتانا صرفِ نظر ہوگیا کہ ''ہندی''، ''ہندو'' اور ''ہندوستان'' تینوں لغات فارسی زبان کے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے باشندگان خود کو ''ہندو'' نہیں بتاتے تھے بلکہ متعدد سمپر دائے، یعنی متعدد فرقوں، جیسے ''شیو''، ''بودھ''، ''ناتھ'' وغیرہ سے وابستگی کے حامل تھے، مگر یہ تمام تر فرقہ جات وید، اپنشد، سمرتیوں وغیرہ کو عقیدتمندانہ نظر سے دیکھتے تھے اور ''آریہ'' مستعملات سے باہر ایک لفظ ہی بن کر رہ گیا تھا۔ مزید وضاحت میری تصنیف

Muslim world : Islam Breaks Fresh Ground

سے رجوع کرنے پر قارئین کرام حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندو، ہندی، ہندوستان وغیرہ متعلقاتِ بیانی کو جملۂ معترضہ کے تحت دیکھا جانا چاہیئے، جو برسبیل تذکرہ در آیا۔ اردو بننے تک زبان کا بھرپور جائزہ ''تاریخ زبان اردو'' میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ مولانا شمس صاحب نے لسانی منتجات بغیر مواخذ کو سامنے رکھتے ہوئے حاصل کئے ہیں، کیونکہ موصوف کو کئی زبانوں پر قابلِ توصیف وستائش عبور حاصل ہے۔ دہلی میں اردو کا ارتقا، اردو الفاظ کس طرح معرضِ وجود میں آئے، فارسی عربی الفاظ کے معنوں میں کیا کیا تصرفات مزاج و آہنگ سے ہوئے۔ مثلاً ''دبنگ'' فارسی میں پست فطرت آدمی کو کہتے ہیں مگر اردو میں رعبدار آدمی کے معنوں میں بولا جانے لگا۔ مشاعروں کی ابتدا خان آرزو نے کی۔ متعدد زبانوں کے الفاظ داخل ہونے لگے۔ بیشتر الفاظ کے معنوں میں تبدیلی در آئی۔

کچھ لفظوں کی نشاندہی مولانا شمس نے کی ہے، جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی معلوماتی بھی ہے ۔ بطورِ مشتے نمونہ از خروارے، چند ایک الفاظ ملاحظہ ہوں

لفظ	اصل معنی	نئے معنی (اردو میں)
مہتر	بزرگ	خاکروب
راشی	رشوت دینے والا	رشوت لینے والا
سیر	جانا	تفریح
رائج	رواج دینے والا	رواج پانے والا
اوقات	وقت کی جمع	حیثیت
وقعت	جنگ وجدل	عزت
قارورہ	شیشہ	پیشاب
غربت	مسافرت	مفلسی
غریب	مسافر	مفلس

ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ بھی تصرف کیا جانے لگا۔ نئے الفاظ اور نئے محاورے پیدا ہونے لگے۔ جیسے: اللے تللے، اہلے گہلے، ان بن، انجر پنجر، تابڑ توڑ۔۔۔ ایسے ہی بیشمار اور کہاوتیں، نئے محاورے بھی پیدا ہوئے اور مروجہ ہندی سے بھی لیے گئے ۔ جیسے: پاپڑ بیلنا، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ،صلواتیں سنانا وغیرہ۔

کچھ محاورے خاص قلعۂ معلیٰ میں پیدا ہوئے اور زبان میں داخل ہوگئے ۔ جیسے: مردہا(آدمی کو بادشاہ کے سامنے لانے والا)، خاصہ تراش (بادشاہی حجام)، خاصہ (شاہی خانہ)،نواب ناظر اور عرض بیگی (مہتم آدابِ دربار)، خواص (خدمتگار)، فوجدار(فیل بان)، قلاوُز(غلام)،سکھ(نیند،خواب)۔

ان سب پر غور کر کے مولانا شمسؔ نے درست نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک ایسی زبان بن گئی، جو اس برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کے مذہب، جغرافیہ، رسم ورواج، تہذیب وتمدن اور صدیوں کی تاریخی واقعات کی حامل ہے۔

بہت سے الفاظ میں حرکت کا فرق ہوگیا، جیسے میت (می یت) کا میت ہوجانا۔ زیر زبر کے فرق سے الفاظ کا لہجہ اور لوچ بدل کر اردو مزاج کے موافق بنتے گئے، ''ع'' اور''ح'' کو مخرج سے ادا کرنا غیر فصیح سمجھا جانے لگا۔ موصوف نے پندرہ، سولہ سال کی عمر میں جب اپنے والد (سلطان العلماء مولانا سبطِ حسین صاحب مجتہد) کا کہا ہوا اردو مرثیہ پڑھا تو ان کے والد مرحوم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ اردو زبان میں ''ح'' اور''ع'' کو مخرج سے پڑھنا غیر فصیح ہے۔

اردو کو ٹکسالی زبان تک منزل بمنزل لے جانے میں لکھنؤ کا خاصا اہم رول رہا ہے۔ اگر اس کا بھرپور جائزہ لیا ہے تو مولانا شمس ہی نے اپنی تصنیف ''تاریخ زبان اردو'' میں لیا ہے ۔ اگر یہ دعویٰ پیش کیا جائے کہ اردو کو اعلیٰ منصب تک پہنچانے میں لکھنؤ کے زباندانوں اور شاعروں کا مخصوص وممتاز کردار رہا ہے تو اس دعوے کو درست ہی قرار دیا جائے گا۔ لکھنؤ کی آب وہوا، یہاں کی عام فضا میں زبان کی لطافت اور لہجہ میں لوچ اور شیریں کیفیت کا سحر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لکھنؤ والے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جن کے باپ دادا دہلی اور نواح دہلی مقامات سے آئے تھے، جب ان سب کی زبان اس دور میں دہلی ہی کی زبان سمجھی جاتی تھی۔

سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، میر حسنؔ، شاہ نصیر کے الفاظ ومحاورات میں استعمالات وغیرہ کو ناسخؔ ہی نے آراستگی وشستگی عطا کی۔ شیخ امام بخش ناسخؔ زبان اردو کے مصلح تھے۔ انھوں نے اردو کو تراش خراش کے ایسا درست کیا کہ اس میں فارسی زبان ایسی لطافت وصفائی پیدا ہوگئی۔ ناسخؔ کی اس کارکردگی کی تعریف بیک زبان سبھی نے کی ہے۔ ناسخؔ کے تصرفات آج تک مقبول ہیں۔ داغؔ دہلوی تک نے لکھنؤ کی، ماسوا چند ایک، تمام تر اصطلاحات اختیار کر لی تھیں۔ ناسخؔ کے وضع کردہ اصولوں پر ان کے شاگرد بھی کام کرتے رہے۔ رشکؔ، میر عشقؔ (تصنیف ''رسالۂ میر عشقؔ'')، منیرؔ، خورشیدؔ، بنیاد حسین جاہ اور ان کے پسر کمالؔ، عزیزؔ، محشرؔ، مودبؔ وغیرہ کی تشریحات کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے مولانا شمسؔ نے جو جائزہ لیا ہے، وہ قابلِ توصیف وتحسین ہی نہیں

بلکہ زبان کے ارتقائی منازل پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اردو کو ٹکسالی زبان بنانے میں لکھنؤ کے شعراء ادباء نے اساسی رول ادا کیا ہے۔ عبدالحق کی تردید کرتے ہوئے شمسؔ صاحب نے ثبوت فراہم کرتے ہوئے کہا ہے:

''شعرائے لکھنؤ کا کلام ثقیل اور نامانوس عربی، فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے پاک ہے۔ وہ سہل، شستہ اور عام فہم زبان میں شعر کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔''

''تاریخ زبان اردو'' اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے اس افادیت بھرپور تصنیف سے بہتر کتاب ہنوز نہیں گزری ہے۔ ''لکھنؤ کی زبان'' کلاسیکی تصنیف ہے، جس کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۸ء میں نکلا تھا۔ لکھنؤ کی زبان پر بے جا اعتراض کرنا دہلی والوں کی عادت میں داخل ہو گیا تھا، لہٰذا معترضین کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کوئی مجتہد ہی کر سکتا تھا۔ جناب شمسؔ صاحب نے اردو زبان کے مسائل کو فلسفۂ لسان اور تاریخ کی روشنی میں دیکھنے پر توجہ صرف کی۔ انھوں نے انشاء اللہ خاں انشاء کا تمام تر مطالعہ کرتے ہوئے چار شرطوں کو پیش کیا ہے، جو اہل زبان بننے کے لئے ضروری ہے۔

۱۔ ماں باپ اہل زبان ہوں۔
۲۔ اہلِ زبان کی صحبت میں رہے
۳۔ تحقیق و تحصیل زبان میں مشغول رہے۔
۴۔ آدمی پرکھنے والا اور ذہین ہو

انشاؔء نے لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان پر ترجیح دی ہے، کیونکہ لکھنؤ کے لوگ اپنے لہجہ کے اعتبار سے فصیح و بلیغ، زبان شناس ہیں۔ مولانا امداد اثر نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ دہلی شہنشاہی کا آفتاب لبِ بام آچکا تھا، لہٰذا اردو شاعری کے آغاز ہی سے دلی میں بدامنی کا دور دورہ تھا اورنگزیبی عہد کی شام ہوتے ہی انتشار اور افراتفری سے دلی میں سکونت دشوار ہو گئی تھی۔ مرہٹے، سکھ، افغان، جاٹ وغیرہ نے تباہ حالی کے زمانہ کا آغاز کر دیا تھا۔ ہوتے ہوتے انگریز چھا گئے اور آخری مغل شہنشاہ ظفر قیدی بنائے جانے کے بعد جلاوطن کر کے رنگون منتقل کر دیئے گئے تھے، مگر سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملتے ہی وہاں امن وامان قائم ہو چکا تھا۔ دلی کی حالت یہاں تک بگڑی کہ اہل کمال لکھنؤ پہنچنے لگے۔ میرؔ، سوداؔ، حسنؔ، انشاؔء وغیرہ نے لکھنؤ میں پناہ لی۔ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دلی سے بھاگ کر آنے والے عوام وخواص کے لئے سکون و اطمینان کا مرکز فراہم کر دیا تھا۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا اور اس طرح فیض آباد میں آراستہ محفل شعر وسخن، ذوق وشوق، فنون لطیفہ، نیز دیگر علوم میں مہارت کی کاوشیں لکھنؤ تک فروغ پذیر ہونے لگیں۔ اگر ناسخؔ سے لے کر مولانا شمسؔ تک کے شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاخوفِ تردید یہی حقیقت ابھرتی ہے کہ موجودہ اردو دبستان لکھنؤ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ لکھنؤ کی زبان ایسی کلاسیکی تصنیف ہے کہ اس کا بغور مطالعہ زباندانی کے جملہ کوائف فراہم کرتا ہے۔

''تصنیفات محمد باقر شمسؔ میں شعور وشاعری'' بڑی آن بان کی تصنیف ہے۔ اس سے مخاطب ہونا بھی خود تعلیمی کے ذرائع فراہم کر سکتا ہے۔ کتاب مقدمہ سے شروع ہوتی ہے۔ معیارِ شعر وشاعری کا دارومدار صحیح افہام وتفہیم کے جملہ اجزائے ترکیبی پر ہوتا ہے، جو معنی ومفہوم کو مجروح ہونے سے بچاتے ہیں۔ غلطی کی چار صورتیں ہیں (۱) صرفی (۲) نحوی (۳) روزمرہ اور محاورہ (۴) بے محل صرف، جو بلاغت کے منافی ہو۔ بحث خاصی دلچسپ بھی ہے اور افادیت سے معمور بھی، مگر ہر نشاندہی سقم پر شمس صاحب سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، جیسے سرور جہان آبادی کی نظم ''بیر بہوٹی'' کے پہلے شعر پر

آہ اے ننھے سے کیڑے! نازشِ صحرا ہے تو
باغِ عالم میں شگفتہ اک گلِ رعنا ہے تو

شمسؔ صاحب کی رائے میں یہاں ''آہ'' بے محل ہے۔ ''واہ'' ہونا چاہیئے۔ میری ناقص رائے میں لفظ ''واہ'' فصاحت کا خون کرتا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل روزمرہ میں ''آہ'' کا استعمال

استعجابی کیفیت سے تڑپ اٹھنے کے مفہوم میں جائز قرار پاتا ہے۔ اگر سرور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بھی نظم ایسی نہیں ملے گی، جس میں لفظ ''آہ'' کا استعمال نہ ملے۔ سرور نقیبی قوم پرست شاعر تھے۔ بڑے شاعر تھے۔ ہر بڑا شاعر اجتہادی بھی ہوتا ہے۔ راقم الحروف کی انگریزی تصنیف

Avant Grade Poets of Nationalism Suroor Jahanabadi & Chakbast

جو بھارت سرکار سے فیلو شپ ملنے پر سپردِ قلم کی گئی، اشاعت کے لئے تیار کی جارہی ہے، جس میں منجملہ دیگر موضوعات، سرور کے یہاں لفظ ''آہ'' کی تشریح بھی شامل ہے۔ لفظ ''آہ'' اور ''ہائے''، کبھی کبھی شدتِ جذبات کے تحت ''واہ'' سے بہتر ہوجاتے ہیں۔ شمسؔ صاحب اس نکتہ کو اگر توجہ کے قابل بھی سمجھیں گے تو مجھے دلی مسرت ہوگی۔ شمسؔ صاحب ہی کی یہ رائے کہ ''ناسخ و آتش'' میں جو روانی ہے، وہ ''داغ و امیر'' میں نہیں، قابلِ داد ہے۔

انیس کے مشہور شعر:

انیسؔ! دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

پر تین مشاہیر کی آرا پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں انیسؔ کے اس مقطع میں ''ٹھہر جاؤ'' کی جگہ ''ذرا ٹھہرو'' ہے، یعنی:

انیسؔ! دم کا بھروسا نہیں، ذرا ٹھہرو
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

''دم'' کو سانس، پھونک اور طاقت کے معنی و مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ''ذرا ٹھہرو'' یعنی ''ذرا رکو تو'' کے مترادف ہے۔ شعر کا مطلب صاف و شفاف ہے۔ انیسؔ سانس، طاقت، پھونک وغیرہ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ چراغ زندگی کو ہمیشہ باد مخالف کا خوف رہنا چاہئے۔ جلد بازی اور افراتفری میں کوئی کام کرنا بے سود ہوسکتا ہے، سوچ سمجھ کے آگے بڑھو۔ چراغ زندگی کبھی بھی بجھ سکتا ہے۔ شعر بے معنیٰ نہیں ہے معنیٰ خیز ہے معنیٰ انگیز ہے چراغ ہی اندھیروں میں ساتھ دیتا ہے۔ اس کو روشن رکھنا ہی چاہیئے۔ مجھے آغا سروش کی رائے میں وزن معلوم ہوتا ہے اور وژن (Vision) نظر آتا ہے۔ جناب مکرم لکھنوی کی رائے بالکل ''بے دم'' معلوم ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر انیسؔ و دبیرؔ ہی ہیں، غالبؔ و اقبالؔ نہیں۔

غالب کے شعر:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

پر نیاز فتحپوری کی اصلاح پر بڑی عالمانہ بحث پیش کی گئی ہے۔ شمسؔ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہی بات ''مہتابِ داغ'' کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ شمسؔ صاحب کی ایک ایک رائے شعری میزان فراہم کرتی ہے۔ مثال دینا طوالت کا موجب ہوگا۔ فرمودۂ شمسؔ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے اور ان کی یہ رائے کہ داغؔ کو تصرفِ الفاظ کا سلیقہ نہ تھا، دقیق نکتہ شناسی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر داغؔ کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

غش کھا کے داغؔ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

جب یہ غیر ارادی طور پر ہوا تو قدموں پر گرانے کے بجائے ''آغوش'' میں گرانا بہتر ہوتا، یعنی یوں

غش کھا کے داغؔ یار کی آغوش میں گرا

بہت خوب اصلاح ہے۔ اسی نوعیت کی اصلاحات اور بھی ملتی ہیں اور شمسؔ صاحب کے شعری شعور کی واضح آئینہ دار ہیں۔

شمسؔ صاحب نے اقبال پر بھی قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ ہندوستان میں تو تعریف و توصیف اقبال میں رطب اللسان ادیبوں کو ماہرین اقبال سمجھا جاتا ہے۔ ''بال جبریل'' سے جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں، یعنی اغلاط اقبال کی نشاندھی کی گئی ہے، سبھی درخورِ اعتنا ہیں۔ ''اقبال کی خامیاں'' کتاب لکھ کر جوش ملسیانی نے بھی جرأتمندانہ کام کیا تھا۔ اقبال کا اردو کلام پنجابیت سے مجروح و معذور ہے۔ اگر منصور سلیم چشتی نے میری تصنیف

Iqbal in Final Countdown (New Delhi)

ملاحظہ فرمائی ہوتی تو غالباً وہ نہ لکھا جاتا، جو انھوں نے شمسؔ صاحب کے اقبال پر اعتراضات کے بارے میں لکھا۔ اقبال کو بالعموم ذہنی تحفظات نے وہ مقام بخشا ہے جس کے اقبال مستحق نہ تھے۔ اقبال کے کلام میں فلسفیانہ نکات ملتے ہیں، مگر ان کو فلسفی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں باوجود نا کام رہے۔ امین زبیری کی تصنیف ''خدو خالِ اقبال''، ''شاعر بمبئی اقبال'' (خصوصی نمبر ۱۹۸۸ء) اور میری متذکرہ بالا کتاب، تینوں کا مطالعہ ہی اقبال کو صحیح روشنی میں پیش کرتا ہے۔ شعر اقبال کو اتنا الجھاؤ دے دیا گیا ہے کہ وہ قریب قریب معدوم نظر ہی ہوجاتا ہے، لہٰذا ضمنی باتوں پر لب کشائی دشوار ہوجاتی ہے۔

''کلام فانی''، ''کلیاتِ جگر''، میں مشمولہ ''شعلۂ طور''، ''غزلیاتِ اصغرؔ'' ماہرالقادری کے مجموعۂ نعت ''ذکر جمیل'' اور ان کی کہی ایک حمد، فیضؔ کے مجموعۂ کلام ''نقش فریادی''، ''ابن انشا اور ہم''، میرا جی کی نظم ''جوئبار'' وغیرہ موضوعات پر زبان و بیان، محاورہ و روزمرہ محاسنِ شعریہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شمس صاحب نے گرانقدر ادبیاتی و انتقادیاتی خدمت انجام دی ہے۔ آجکل کے بیشتر شعرا خود روشعرا ہیں، یعنی انھوں نے اصلاح لینے کو تضیع اوقات ہی سمجھ لیا ہے۔ شمسؔ صاحب کی شعری صلاحیت وشعور اس زمانہ کے پروردہ ہیں، جب فصاحت و بلاغت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ شعری شریعت و طریقت میں اس کی آج بھی اشد ضرورت ہے۔

شمس صاحب کے چیدہ چیدہ مقالات و مضامین جو ''طلوع افکار'' کراچی کے شماروں میں شامل اشاعت ہوئے ''نگارشاتِ رنگ رنگ'' میں حسین انجم (مدیر طلوع افکار) نے حسن ترتیب سے شائع کئے ہیں اردو و فارسی ادبیات میں قابل رشک مہارت کے حامل جناب حسین انجم ایک ممتاز نام ہے۔ اچھے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے نغز گو شاعر بھی ہیں۔ متذکرہ مرتبہ کتاب میں تعارف انھوں نے ہی قلمبند کیا ہے۔ تعارف نہایت بلند پایہ تحریر ہے۔ شمسؔ صاحب کے جملہ کوائف ادبیات اور ان کے حسب ونسب پر ارتکازانہ روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حسین انجم نے مولانا محمد باقر شمسؔ کی جملہ تصنیفات پر ایک سیر حاصل نکاتیاتی وانتقادیاوی تلخیص فراہم کردی ہے۔ سپردِ قلم کیا ہوا تعارف کیا ہے، بحر در کوزہ ہے۔ شمس صاحب خاندانِ اجتہاد کے شجرہ میں مشمول ہیں۔ خاندان اجتہاد کے مورثِ اعلیٰ مولانا دلدار علی غفرانمآب ہندوستان کے پہلے شیعہ تھے، جو ۱۲۳۵ھ یعنی قریب ساڑھے چار سو سال پہلے واصل بحق ہوئے۔ یہاں بطورِ جملۂ معترضہ ہی سہی، ایک بات کہنے کو جی کرتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر شریعتی کے حوالہ سے اپنی تصنیف

Muslim World: Islam Breaks Fresh Ground (Ashioh New Delhi)

میں لکھا ہے کہ اسلام میں شیعہ تحریک تاریخی وثقافتی تعامل مرجعی واجتہادی تحریک تھی۔ مجتہد بدلتے زمانہ پر بھی نظر رکھتا ہے، مطالباتِ زمانہ کے لحاظ سے مذہب کو اس طرح ہم آہنگ رکھتا ہے۔ کہ قرآن وحدیث کی روح مجروح نہ ہو۔ سرسید جیسے کٹر سنی نے بھی اپنے ایک مضمون مشمولہ ''تہذیب الاخلاق'' میں منصبِ مجتہد کی تعریف کی ہے، جس کا بطورِ خاص حوالہ مظہر حسین نے اپنی حالیہ تصنیف ''علی گڑھ تحریک سیاسی وسماجی پس منظر'' (انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔۲) میں ذکر کیا ہے۔ شمس صاحب بھی ادبیاتی مجتہد ہیں، کیونکہ ان کی دانشوری روایت سے درایت کو محیط ہے اپنے مقالات ومضامین (جو نگارشات رنگ رنگ میں شامل ہیں) میں تخلیق زبان کا مسئلہ، اردو کے مرکز کا مسئلہ مورد الفاظ کا مسئلہ اردو میں عطف و اضافت، جوش کا شاعرانہ مرتبہ، اردو شاعری پر آزاد کا اعتراض، جنسیات میں فحاشی وغیرہ بطورِ خاص افادیت واہمیت سے بھرپور ہیں۔

غرض، مولانا موصوف دبستان لکھنؤ کے نمائندہ ہیں اور لکھنؤ کی روایت، زبان واسلوب کو پاکستان میں بھی فروغ پذیر کئے ہوں، درآں حالیکہ ان کی ہر ایک بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مگر ان سے اختلاف بھی بے اہمیت قرار نہیں پاتا۔ موجودہ دور تکنیکی دور ہے اور آج دنیا عالمی گاؤں (global village)

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر۔۔۔۔۔)

سنتے ہو وہ جو میں سنتا ہوں اور دیکھتے ہو وہ جو میں دیکھتا ہوں۔ مگر تم نبی نہیں ہو۔ بے شک وزیر ہو۔"

حضرت علیؑ بن ابی طالب کے مرتبہ سے ناشناس افراد یقینا اس کو غلو سمجھیں گے مگر وہ ایک حقیقت ہے جسے امیر المومنینؑ نے رسولؐ اللہ کی زبانی بیان کیا ہے۔

یہ امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے اقوال وتعلیمات تمام مسلمانوں کی واقفیت کے لئے پیش ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان اقوال پر غور کیا جائے تو مسلمانوں میں افتراق کی خلیجیں بہت کم ہوجائیں اور کم از کم وہ منافرت جو باہمی پائی جاتی ہے دور ہوجائے۔ کیونکہ یہ اس ہستی کے تعلیمات ہیں جو تمام مسلمانوں میں نقطۂ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے کسی نہ کسی درجہ پر تمام مسلمان امام خلق اور پیشوائے مطلق تسلیم کرتے ہیں۔

والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

❀❀❀

(بقیہ صفحہ ۲۶ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

میں تبدیل ہورہی ہے، جس کے اثرات زبان وبیان، روزمرہ محاورات وغیرہ پر بھی مرتب ہورہے ہیں، لہٰذا ترمیمات کے شعبہ ہائے زباندانی وغیرہ بھی اچھوتے نہیں رہ سکتے، مگر دہلی کی زباندانی بری طرح متاثر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب وشاعر جو دہلی زباندانی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، عجیب اردو لکھتے ہیں۔ مثلاً ترجمہ گیتا میں ارجن کی بابت کہا ہے:

کھڑے سے ہو گیا بیٹھا

کیا اردو ہے! مولانا موصوف پر ایسی گرفت نہیں کی جاسکتی، اچھے شاعر اور بڑے ادیب ہیں۔ استاذی اثرؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، سرتیج بہادر سپرو، مسعود حسن رضوی ایسے پائے کے ادیبوں نے مولانا موصوف کے کام ونام کو سراہا ہے۔ ان مکتوبات پر مشتمل ایک تصنیف بھی شائع کی جانا چاہیئے۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

(۱۰۰)

زینبؑ یہ سن کے خیمے سے نکلیں برہنہ پا
مقتل کی سمت دوڑ پڑیں دے کے یہ صدا
بھیا، میں آرہی ہوں، توقف کریں ذرا
عباسؑ سا وہ بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا
میں رن سے اپنے لال کو خیمے میں لاؤں گی
ساتھ آپ کے جوان کی میت اٹھاؤں گی

(۱۰۱)

دیکھا بہن کو رن میں جو بے مقنع و ردا
شبیرؑ نے لرز کے کہا، کیا غضب کیا
زینبؑ، یہ کیا، ابھی تو ہے زندہ یہ بے نوا
ہم کو ابھی سے شام کا منظر دکھا دیا
خیمے میں جاؤ، بنتِ پیمبرؐ کا واسطہ
زینبؑ، تمہیں جوانئ اکبرؑ کا واسطہ

(۱۰۲)

پلٹی جو رن سے خیمے کو زہراؑ کی نورِ عین
لاشِ پسر اٹھا کے چلے شاہؑ مشرقین
عباسؑ ہیں نہ قاسمؑ و سعد و زہیر قین
فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ
اٹھو، چلیں کہ ہم ابھی زندہ ہیں، دوستو
مولاؑ جواں کی لاش پہ تنہا ہیں، دوستو

(۱۰۳)

ساحرؔ! بس اب خموش کہ ہے جوش پر بکا
پہلا یہ مرثیہ مرے مولاؑ کی ہے عطا
دستِ طلب بڑھا کے سوئے شاہؑ کربلا
کیجئے زبانِ فاخرؔ مغفور میں دعا
مطلب یہی ہے آپ سے بس اس حقیر کا
یا شاہ دیں! قبول ہو ہدیہ فقیر کا

ماخوذ از کتاب مجموعہ مراثی احساس غم، مصنفہ ساحرؔ اجتہادی

نوٹ: مرثیہ میں جن شعراء کے اسماء گرامی مذکور ہیں ان کے بالاختصار تذکرے آئندہ شمارہ میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔

(ادارہ)